

طبر

احمد ندیم قاسمی

shahid.riaz@gmail.com

سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ شہباز کا قد بہت چھوٹا تھا۔ لوگ اس کے قریب سے گزرتے تو اُسے یوں دیکھتے جیسے وہ سب کا برخوردار ہے اور جیسے وہ کترا کرنے لگا تو اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیں گے۔ اُس نے بڑی بڑی مونچھیں بھی رکھ لی تھیں جنہیں وہ ہر صبح گھی سے چڑھاتا تھا۔ اُس نے قمیص بھی کانوں کی لوڈوں تک پھیلا لی تھیں۔ وہ اپنے پنڈوں میں ہاتھی دانت کا ننھا سا قوی کنگھٹا کچھ اس ادا سے لگاتا تھا کہ وہ اس کے دو طروں والی پٹری سے بھی نہیں چھپتا تھا۔ ہر روز داڑھی منڈواتا تھا۔ دھاری دار بوکی کے کرتے میں سیپ کے بنوں کی بجائے چاندی کی زنجیر لٹکا رکھی تھی جس کے آخری سرے پر گھونگھریاں لگی تھیں اور وہ ہر قدم پر یوں جھتی تھیں جیسے چڑیوں کے گھونسلوں میں ان کے بے پر سچے بولتے ہیں۔ پھر اس کے ہاتھ میں تھرہنے لگی تھی جس کا چوہی دستہ اس کے قد سے ذرا ہی کم تھا۔ اتنے اہتمام کے باوجود لوگ اس سے بے خبر گزر جاتے تھے۔ یا بعض منچلے اس کی ہیبت دیکھ کر مسکرا دیتے تھے اور اگر پوچھتے تھے کہ ”آج کدھر کی مار ہے شہباز خان؟“ تو اُن کا لہجہ کچھ ایسا ہوتا تھا جیسے پوچھ رہے ہیں ”آج کہاں مار کھانے چلے ہو شہباز؟“

ماں باپ کا اکلوتا بیٹا نہ ہوتا تو اس کی جوانمردی کو بل کی پھال برسوں پہلے کھود کر ہموار کر چکی ہوتی مگر وہ والدین کی آخری عمر کی کمائی تھا اور اس کے باپ کو یقین تھا کہ اگر وہ اپنے بازو میں اپنے پیڑوں میں تعویذ نہ باندھتے تو دوسرے لڑکوں کی طرح شہباز بھی کسی دوسرے گھر میں جنم لے چکا ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے شہباز کو ایسے چاؤ چوڑیوں سے پالا کہ دس برس کی عمر تک وہ روٹی کو لوتی کہتا رہا۔ پھر جب اس کی میسں بھیگیں اور کندھے پر ہل چٹائی رکھ کر کھیتوں کی راہ لینے کا زمانہ آ گیا تو ماں باپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک ان کے دم میں دم ہے شہباز کھیت کھلیاں کا کام نہیں کرے گا۔ اسی لئے انہوں نے اپنے مکان کے پچھواڑے میں دروازہ نکلوا کر اسے دکان کھول دی مگر پانچ چھ مہینے ہی میں اس نے دکان کو برابر کر دیا اور جس روز دکان کا دروازہ چنوا یا گیا تو یکا یک سارے گاؤں میں یہ خبر جیسے کود پڑی کہ شہباز کو لڑکیوں نے لوٹا ہے۔ یہ نئی نئی جوان ہوتی ہوئی لڑکیاں ایک کر کے شہباز کے پاس آتیں، اس کی طرف پیار سے دیکھتیں..... ”ہائے وے شہباز! تیری آنکھیں تو بن سرے کی سر میلی ہیں“ جیسی باتیں کرتیں اور شہباز انہیں دو دو سیر گڑ مفت میں تول دیتا۔ شہباز نے بھی یہ باتیں سنیں۔ اسے غصہ آیا مگر وہ کس کس سے نمٹتا۔ دن بھر دکان کے چنے ہوئے دروازے کے پاس گلی کے کنارے بیٹھا گھی لگی مونچھیں مروڑتا رہا کہ شاید کوئی اس کا مذاق اڑانے کا حوصلہ کرے اور وہ اس کی بوٹیاں اڑا دے، مگر لوگ اس کے قریب سے یوں شرما کر نکلتے چلے گئے جیسے شہباز کے روپ میں کوئی جوان لڑکی بیٹھی تھی۔

عصر کی اذان کے ساتھ ہی لڑکیاں دو دو گھڑے سروں پر سجائے ٹولیاں بنائے گھروں سے نکلتیں تو اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اور دکان کے چنے ہوئے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے ہنسی پر بہت ضبط کیا مگر جب ایک بے قابو ہو گئی تو سب ہنیں دیں اور اتنی نہیں کہ اللہ دین کی منگیت

جنت کا تو ایک گھڑا بھی گر کر ٹوٹ گیا اور جب جنت چلی گئی تو وہ دیر تک گھڑے کے ٹوٹے ہوئے کھڑوں کو بیٹھا جوڑتا رہا۔

اس روز شہباز نے کھانا بھی نہ کھایا اور لحاف میں منہ چھپا کر روتا بھی رہا۔ مگر آدھی رات کو ایک دم اس کے جی میں جانے کیا آئی کہ اٹھا اور باپ کی پرانی تمبر کو کھنٹی پر سے اتار کر انکشت شہادت کی پور پر اس کی دھار آڑا تا رہا اور پھر گہری نیند سو گیا۔

کانوں کی لوؤں تک قلمیں اس کے بعد ہی پڑھیں۔ پنوں میں ہاتھی دانت کا کنگھا انہی دنوں سجا۔ بوسکی کے کرتے میں چاندی کی زنجیر اسی زمانے میں چھپھائی اور پگڑی میں ایک اور طرے کا اضافہ بھی جھپی ہوا۔ مونچھیں تو خیر پہلے سے موجود تھیں، البتہ اب زیادہ نوکیلی ہو گئیں۔ اُدھر اس کے ہاتھ میں بالشت بھری قومی دھار والی تیر آ گئی۔ اس ہیئت کے ساتھ اس کی چال میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ چلتے ہوئے دائیں بائیں دیکھنے تک کا انداز بدل گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی دستے کے ساتھ پریڈ کر رہا ہے اور آئز رائٹ اور آئز لفٹ کرتا جاتا ہے۔ لوگوں نے اس اہتمام کا صرف اتنا سا اثر قبول کیا کہ اس پر ڈرا کھل کر مسکرا نے گلے اور ایک بار گاؤں کے نامی بد معاش دلیر نے تو قہقہہ مار کر یہ تک کہہ دیا کہ ”نہ، شہباز کو یوں ہاتھ بھر کا نہ دیکھو۔ جتنا زمین کے اوپر ہے اتنا زمین کے اندر ہے۔ ہم میں سے کون جو اندر دیا ہے جس نے گاؤں کی ایک ایک لڑکی کو ایک ایک بوری گڑ کھلا دیا ہو۔ ہم تو کسی کو ایک ریوڑ بھی دیں تو جان کو آ جاتی ہے۔“ اس پر خوب قہقہے پڑے۔

مگر اس روز دلیر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جب شام کے بعد اس کی چوپال پر کوٹھے کے وسط میں الاؤ انگاروں میں بدل گیا اور لوگ گاؤں کی سیاسیات پر باتیں کرتے کرتے اونگھنے اور اپنے گھروں کو جانے کی تیاریاں کرنے لگے تو چوپال کا ایک کواڑ ایک لمبی بھیانک چیخ کے ساتھ کھلا اور شہباز اپنی تیر سمیت اندر آ گیا۔

”دلیر خاں!“ شہباز نے وہیں لوگوں کے جوتوں میں کھڑے ہو کر کہا ”آج تم نے بھری گلی میں میری ہنسی اڑائی ہے۔ مگر بھائی، نہ دلیری نام سے آتی ہے نہ جو اندر ہی قد سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سارا جھگڑا حوصلے کا ہے اور مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ میں تمہاری ہی چوپال پر تمہارے ہی دس پندرہ آدمیوں کے درمیان بالکل اکیلا آؤں اور کہوں کہ آج کے بعد میری ہنسی نہ اڑانا۔ کہیں مجھے اپنی تیر سب سے پہلے تیری نہ آ زما نی پڑ جائے۔“ ایک بار تو چوپال پر جیسے اُلو بول گیا، مگر پھر دلیر مسکراتا ہوا اٹھا اور شہباز کے پاس آ کر بولا ”مزے آ گئے بھائی شہباز خاں! تمبر کو ہاں کونے میں رکھ دے اور آ میری چھاتی سے لگ جا۔ آج سے تو میرا یار ہے۔“

دلیر سے یاری کے بعد لوگوں کو شہباز پر ہنسنے کا حوصلہ تو کبھی نہ ہوا لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دلیر کی چوپال پر شہباز کی حیثیت تھوڑا تازہ کرنے والے سے زیادہ نہیں ہے۔ خود شہباز بھی جانتا تھا کہ دلیر مجھے میرے قد سے زیادہ نہیں ابھرنے دیتا۔ خاص طور سے اس وقت تو وہ اپنے آپ کو دھرتی میں

دھنسا ہوا محسوس کرتا تھا جب دلیر اور اس کے ساتھی اپنے اپنے کارناموں کے قصے لے بیٹھتے تھے اور دشمن کو قتل کر کے اس کی ہڈیاں تک غائب کر دینے کی داستانیں سناتے تھے۔ پھر جب سب اپنے اپنے معاشقوں اور اغواؤں کا ذکر کرتے تھے تو شہباز کے دل میں جنت کے ساتھ منگھٹا نہ محبت کا جذبہ پٹاٹے سے چھوڑتا رہ جاتا تھا کیونکہ اب اللہ دین سے اس کی شادی ہو گئی تھی اور اللہ دین بڑا جنگ قسم کا شوہر تھا جس کا ہاتھ ذرا ذرا سی بات پر سیدھا بیوی کی چوٹی کی طرف لپکتا تھا۔

ایک بار چوپال کا دروازہ اندر سے بند کر کے لوگ اپنے اپنے پستولوں اور ریوالوروں کو جانچ تول رہے تھے جب دلیر نے اپنا ریوالور کھول کر دیکھا اور پھر شہباز کی طرف تان کر مسکرانے لگا۔ اس پر جب شہباز بھی مسکرانے لگا تو دلیر نے کہا ”مسکرامت شہباز خاں! ریوالور بھرا ہوا ہے۔ انگوٹھے والی انگلی کو ذرا سا دبا دوں تو تیرا بھیجا سامنے دیوار سے جا چٹے۔“ پھر اس نے تھے ہوئے ہاتھ کو حرکت سی دی۔ ریوالور کے دبانے میں خفیف سی جنبش ہوئی اور دلیر نے گھوڑا دبا دیا۔ گولی تڑ سے نکلی اور شہباز کو ایسے لگا جیسے وہ اس کے دونوں طروں کے بیچ میں اس کی گچڑی کے بالائی بیچ کو چاٹتی ہوئی نکل گئی ہے۔ سب لوگ پہلے تو سنائے میں آ گئے، پھر دلیر کو ہنسا دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے اور اتنے ہنسے کہ شہباز غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر جب وہ اٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے سینے اور پیٹ کا پسینہ اس کی رانوں سے بہہ نکلا ہے اور وہ کانپ رہا ہے اور اس کا منہ کھلا ہے اور پوٹے اکڑ گئے ہیں۔ ایک پل کے لئے اس کا جی چاہا کہ مارے شرم کے اپنا سر سامنے چولہے میں بھری ہوئی بھو بھل میں دے مارے، مگر پھر وہ ایک دم سنبھلا اور زبان کو منہ میں گھما کر اور حلق کو تر کر کے بولا۔ ”تمہارا نشانہ خراب ہے دلیر خاں! ریوالور میرے ہاتھ میں دو تو تمہیں بتاؤں کہ بھیجا کس طرح دیوار سے جا چٹتا ہے۔“

اس پر ایسی سنسناتی ہوئی خاموشی چھا گئی جیسے گولی پھر سے چل گئی ہے۔ لوگ اس لئے سہم گئے تھے کہ شہباز نے دلیر کے بھیجے کو دیوار پر دے مارنے کی دھمکی اس وقت دی تھی جب بھرے ہوئے ریوالور میں سے ایک گولی چلی تھی اور ریوالور ابھی تک دلیر کے ہاتھ میں تھا۔ مگر دلیر نے ریوالور زمین پر رکھ کر ہاتھ بڑھایا اور بولا ”ہم یار بناتے ہیں تو یونہی نہیں بنا لیتے۔“ اس کے بعد وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گیا اور لوگ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

”یہ پدا تو نرا قہر ہے۔“

”دلیر سیانا ہے۔ بات کو بڑھنے نہیں دیتا ورنہ آج شہباز کے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔“

”لو اور سنو جس شخص نے آج تک ایک چڑیا نہیں ماری وہ دلیر کو قتل کرے گا؟ دلیر کا خون کرنے سے پہلے کسی اور کا تو خون کرے۔“

”قاتلوں میں بیٹتا ہے، کبھی قتل بھی کر لے گا۔“

”جی نہیں، ہاشت بھر قد والے لوگ چہرہ دشمن کے پیٹ میں مارتے ہیں تو وہ ان کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل جاتا ہے۔“

اس پر زور کا قہقہہ پڑا اور آخری فقرہ بولنے والا بولے چلا گیا۔ ”ہتا ہے۔ آج تک تم نے سنا ہے کہ اس نے کسی دھوبی، میراثی کے بھی تھپڑ مارا ہو؟ مونچھیں اور قلمیں تو بھجورے بھی بڑھا سکتے ہیں۔ تمہی بتاؤ، آج تک کسی ایک بھی لڑکی کے ساتھ اس کی بدنامی ہوئی؟ ایک بار جنت کو گھورا تھا تو اس نے اپنا بھرا ہوا گھڑا اس کے سر پر دے مارا تھا۔“ اس پر سب ایک بار پھر نیسے۔ ”اور اب کے گھورے تو مارا جائے، اللہ دین کی گھوری سے تو دلیر خان بھی ڈرتا ہے۔ نہ جانے دلیر خان کو اس سے کیا کام لینا ہے کہ ساتھ لگائے پھرتا ہے۔ ورنہ میں تو اس ٹے کو تو کر بنا کر بھی ساتھ نہ رکھوں۔ خواہ خواہ آدمی کو جسک کر بات کرنی پڑ جاتی ہے۔ دلیر خان مجھ سے کہے تو شہباز کے سر پر ایسا ہاتھ ماروں کہ سارے کا سارا زمین میں اتر جائے۔ قبر کھودنے کی ضرورت نہ پڑے۔ میں تو حیران ہوں کہ دلیر خان اس کی بات سہہ کیسے لیتا ہے۔

اتنے میں دلیر اور شہباز اندر آ گئے۔ دونوں مسکرا رہے تھے اور ایک دوسرے کے پنچے میں پنچہ دے رکھا تھا۔ چولہے کے پاس بیٹھ کر دلیر نے کہا ”بکرا بکرا شرط اگر تم میں سے کوئی یہ بتا دے کہ میں نے باہر شہباز سے کیا کہا۔“

شہباز بھی چپکا ”کل اس بکرے کو یہیں چوپال میں بھوتا جائے گا۔“

لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر کھسک پھسک کر نکلے۔ پھر ٹولیوں میں بٹ گئے۔ اس دوران میں دلیر حقے کے کش لگاتا رہا۔ شہباز جب بھی مسکرا کر دیکھتا، وہ آنکھ مار دیتا اور شہباز کی ہنسی نکل جاتی۔ لوگ پلٹ کر ان کی طرف دیکھتے اور پھر اندازے لگانے میں مصروف ہو جاتے کہ دلیر نے شہباز سے کیا کہا ہوگا۔

یہ ایک دلیر چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ جیسے نچڑ کر رہ گئی۔ شہباز نے زمین پر پڑا ہوا ریو اور اٹھا لیا تھا اور اسے کھول کر دیکھ رہا تھا کہ کتنی گولیاں باقی ہیں۔ پھر جیسے اس اطمینان کے ساتھ کہ فی الحال ایک ہی گولی استعمال ہوئی ہے اس نے ریو اور بند کیا اور اسے اپنے پنچے میں لے کر دلیر کی طرف بڑی جیدگی سے دیکھنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کو چپ چاپ گھور رہے تھے۔

اچانک ایک ٹولی میں سے ایک شخص بولا۔ ”لو بھئی دلیر کی بھارت کسی نے بوجھ لی ہو تو بتائے ورنہ ہم بتاتے ہیں۔“

دوسری ٹولیاں اب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھیں، اس لئے سب نے کہا کہ جس نے پہلے بوجھی ہے وہ اپنا بکرا قربان کرے۔

ایک میراثی نے کہا ”میں نے بھی بوجھ تو لی ہے پر سرکار کیا کروں، میں تو آپ ہی اپنا بکرا ہوں۔ اگر کل مجھے بھوننے بیٹھ گئے تو مجھے تو اپنی ایک بوٹی

بھی نہیں ملے گی۔“

لوگ ہنسنے لگے۔

شہباز بولا ”تو پھر پہلے تو ہی بتا۔ تیرے لئے بکرے و کرے کی شرط نہیں۔“

سب لوگ مسکرانے لگے تو دلیر اس دوران میں شہباز کے سامنے سے کھسک کر اس کے پہلو میں آ بیٹھا، جیسے اس کے نشانے سے بچ رہا ہے۔

میراثی بولا ”دلیر نے شہباز خاں سے کہا ہے کہ سناؤ بھائی شہباز خاں، کیا حال چال ہے؟“

زور کا قہقہہ پڑا اور میراثی سنجیدہ صورت بنائے ہتھیلیوں میں تمباکو مسلنے لگا۔

”اچھا بھئی اب بکرے والا بولے۔“ دلیر نے کہا۔

بجھارت بوجھنے کا دعویٰ کرنے والا بولا ”دلیر خاں نے شہباز خاں سے کہا ہے کہ جب کسی کو قتل کرنا ہو.....“

ابھی اس نے فقرہ پورا نہیں کیا تھا کہ قتل کا لفظ سن کر شہباز نے ایک جھپٹکے کے ساتھ سر کو گھمایا اور دلیر کو گھورنے لگا۔ بوجھنے والا حیران ہو کر ذرا سا رکا۔

پھر بولا ”جب کسی کو قتل کرنا ہو تو ریوالتور سے نشانہ اس کے گھٹنوں کا باندھتے ہیں تاکہ گولی اس کے پیٹ میں لگے۔ گولی نالی کو ہمیشہ اوپر کی طرف دھکا

دیتی ہے۔“

شہباز نے یکا یک پہلو بدل کر ریوالتور چلا دیا اور بولا۔ ”غلط۔“

دلیر تورا کر ہٹا اور دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کی پگڑی سر پر سے لڑھک گئی۔ سب لوگوں کو یقین تھا کہ شہباز کی گولی دلیر کے کہیں نہ کہیں ضرور لگی ہے۔

دیوار سے ٹکرا جانے کے بعد دلیر نے کچھ اس طرح ہر طرف آنکھیں گھمائیں جیسے گولی ابھی تک کوٹھے میں گولے گھومتی پھر رہی ہے اور دلیر کی

نظریں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔

مگر پھر دلیر نے ہاتھوں سے بکھرے ہوئے پتوں کو سنوارا اور سیدھا بیٹھ کر پگڑی باندھنے لگا۔

”بھئی شہباز خاں! تم نے تو حد کر دی۔“ ایک شخص بولا۔

”خاک۔“ شہباز نے جواب دیا۔ ”گولی تو دلیر خاں کے گلے ہی نہیں لگتی تو حد ہوتی۔“

دلیر اپنی جھینپ چھپانے کے لئے ناصح بن بیٹھا۔ ”ہنسی ہنسی میں بھی ایسا نہیں کرتے شہباز خاں۔ بڑے بڑے حادثات ہو جاتے ہیں۔“ پھر اس نے

ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے ریوالتور اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے تہ بند کی ٹیک میں ڈال کر بولا ”ادھر قتل میں میرا ایک یار ہے۔ اپنی بھری ہوئی

رائفل صاف کر رہا تھا کہ چل گئی۔ گوئی اس کے چھوٹے بھائی کے جاگلی اور اب بے چارہ میشن سپرد ہوا بیٹھا ہے۔“

”مگر دلیر خاں!“ شہباز بولا ”تم تو میرے بڑے بھائی ہو۔“

دلیر سمیت سب لوگ جیسے یہ نئی پہیلی حل کرنے لگے، مگر ایک دم دلیر نے پہلو بدلا، اور شرط ہارنے والے سے بولا ”لو بھئی کل دو پہر تک بکرا یہاں پہنچ جائے۔ نہیں پہنچے گا تو بکری اٹھوا لوں گا۔“

”پہنچے گا بھئی کیوں نہیں پہنچے گا۔“ ہارنے والا بولا۔

پھر محفل منتشر ہونے لگی اور جب کوٹھے میں صرف دلیر اور شہباز رہ گئے تو دلیر نے کہا: ”بیر دھگیڑی قسم! کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔“

”پتہ چل بھی جائے تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا۔“ شہباز بولا ”یہی ہو گا تاکہ میں مرجاؤں گا۔ اچھا چلو میں مر گیا، پھر؟“

دلیر نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے کندھے کو تھپک کر بولا۔ ”تم بڑے نر آدی ہو شہباز خاں۔“

صبح کو ادھر مسجد میں اذان ختم ہوئی، ادھر چوکیدار نے اپنے مکان کی چھت پر نقارہ پیٹ دیا۔ بعض نمازی وضو کو ادھورا چھوڑ کر اللہ دین کے گھر کی طرف بھاگ گئے۔ جنت کی چھین صبح کے اجالے کی سطح پر پتھروں کی طرح لڑھک رہی تھیں اور سارا منظر چٹخا جا رہا تھا۔ وہ جب اپنے سینے کو دو ہتھکڑوں سے بٹیتی تھی تو خاصے فاصلے پر بھی دھمک سنائی دیتی تھی۔

اور دلیر کی چوپال کے ایک گوشے میں شہباز اسے بتا رہا تھا کہ ”میں پہنچا تو دروازہ اندر سے کھلا تھا۔“

”وہ تو میں نے جنت سے کہہ دیا تھا۔“ دلیر بولا۔

”ہاں ہاں، وہی تو کہہ رہا ہوں۔“ شہباز تفصیل سناتے لگا، چراغ جل رہا تھا۔ پہلے تو وہ مسٹ مارے پڑی رہی۔ پھر جب میں نے اس کے پاؤں کے انگوٹھے کو دبایا تو وہ اٹھ بیٹھی اور بجتی ہوئی چوڑیوں کو کہنیوں کی طرف چڑھا کر وہ اٹھی۔ ہولے سے پڑ کوٹھے کی کنجی کھولی اور اندر چلی گئی۔ میں بھی دبے پاؤں اس کے پاس پہنچا تو بولی ”مجھے پتہ ہے تجھے دلیر نے بھیجا ہے۔“ اس پر دلیر خاں! قسم پروردگار کی، میں نے تمہیں ایک دو تین ننگی ننگی گالیاں دے دیں کہ بعد میں وہ بے ایمان ہو جائے تو تمہارا نام نہ لے سکے۔ میں نے کہا ”دلیر کی ایسی تھی۔ میں تو اپنی مرضی سے آیا ہوں اس لئے کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔“ میری آواز شاید ذرا اونچی ہو گئی تھی، اس لئے اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ میں نے کہا ”میں اندھا اور بہرہ نہیں ہوں۔ میں کیسے یہ دیکھ سکتا ہوں کہ چار پیسے کا ایک مزار عتم جیسی عورت کو بالوں سے پکڑے پورے صحن میں گھومتا پھرے۔ میں یہ کیسے سن سکتا ہوں کہ رات اللہ دین نے جنت کو چار پائی پر رسیوں سے کس کر باندھ دیا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور چہنئے کو

چراغ پر گرم کر کے اس کے سینے کو داغدار بنا۔ نہیں جنت میں یہ سب کچھ نہیں سہہ سکتا اور آج رات میں تمہارے اللہ دین کو دوزخ کی طرف روانہ کرنے آیا ہوں۔“ اس پر وہ بولی ”تو پھر تو اتنی لمبی بات کیوں کرتا ہے۔ یہ سور کا بچہ جاگ گیا تو تجھے اپنی مٹھی میں لے کر چرمر کر دے گا۔“ میں نے غصے میں آ کر کہا۔ ”اچھا تو میں اسے جگا کر قتل کرتا ہوں۔“ اس پر جنت نے پھر سے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا اور میں نے پھر سے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ پھر وہ بولی۔ ”دشمن کو ہمیشہ زبردست سمجھنا چاہئے۔ جگانے دگانے کی ضرورت نہیں۔ جاوہ سامنے پڑا ہے، کاٹ کے رکھ دے کہ میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ پر دیکھ، میں نے کہا ہے کاٹ کے رکھ دے۔ گولی وولی نہ چلانا۔ پکس پو پیچھے گی کہ گولی چلی تو تم کیوں نہ جا گیس؟ تیرے کام چلا کہ میں کہہ سکوں مجھے کیا پتہ۔ کوئی آیا اور چپکے سے کاٹ کر چلا گیا۔ بس اب بسم اللہ کر، پر ذرا ٹھہر جا، مجھے اپنی کھاٹ پر لیٹ جانے دے۔“ پھر وہ بلی کی سی چال چلتی اپنی کھاٹ پر گئی اور سوتی بن گئی۔ میں نے تیرے دستے پر ہاتھ رکھا اور دل میں کہا۔ ”یا پروردگار! پہلی بار تیرا زما رہا وہ، میری لاج تیرے ہاتھ میں ہے۔“ پھر میں نے ایک ہی وار میں اللہ دین کے نذرے کو کاٹ دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ چیخے گا۔ اس کی چیخ نے اس کے سینے کو پھیلا یا مگر وہ منہ سے کیسے نکلتی۔ میں نے دوسرے وار سے اس کی گردن کاٹ دی تھی اور اس کا سر لڑھک کر رخ سے نیچے گر گیا تھا اور جب اس کا سر اگرا تو کیا ہوا دلیر خاں! کہ جنت ایک دم بڑبڑا کر اٹھی۔ مجھے ایسے لگا کہ وہ چیخ دے گی۔ مگر پھر اس نے اپنا سر کھاٹ کی پٹی پر دے مارا اور دبے دبے رونے لگی اور میں نے اس پر جھک کر آہستہ سے کہا ”اب نہ روؤ۔ فجر کی اذان کے بعد روٹا۔ اب آرام سے سو جاؤ، اب تمہارے سر کا بھوت اتر گیا ہے۔“

”پھر؟“ دلیر نے کہانی سننے والے بچے کی طرح پوچھا۔

”پھر یہ کہ میں چلا آیا۔“ شہباز بولا۔

”جب تم چلے تو وہ رورہی تھی؟“ دلیر نے پوچھا۔

”ہاں روتی رہی تھی۔“ شہباز نے بتایا ”مگر یہ دکھ کا روٹا نہیں تھا۔ میرے خیال میں ڈر گئی تھی۔ عورت بے چاری کا دل ہی کتنا ہوتا ہے۔“

”اب تو کھل کر رورہی ہے۔“ دلیر نے دور سے آتی ہوئی بیٹیوں کی ادھوری آوازیں پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

شہباز ہنسا ”اب خوش ہو کر رورہی ہے۔“

پھر دونوں جیسے جنت کے رونے پینے کی آوازیں سننے لگے۔

اچانک دلیر بولا۔ ”تم نے ایک ایسا نیک کام کیا ہے شہباز خاں! کہ قسم پیر دھگیڑی، سیدھے بہشت میں جاؤ گے۔ تم نے ایک دیکھی عورت کا دکھ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔ ابھی نہیں، ابھی تو ساری بات کو راز رکھنا ہے۔ جب مقدمہ ختم ہو جائے گا اور میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ اللہ دین کو شہباز کی تبر

نے کاٹا، تو لوگ تمہارے ہاتھ چوم لیں گے۔“

”لوگ چومیں نہ چومیں۔“ شہباز بولا ”پر جب جنت نے میرے ہاتھ چومے تو میں سمجھوں گا میں اتنی مدت تک تمہارے کانٹے نہیں اٹھائے پھر۔“

”مگر تمہاری تیرے کہاں؟“ دلیر کو جیسے ایک بھولی ہوئی بات یاد آئی۔

”فکر نہ کرو۔“ شہباز بولا۔ ”نیا قاتل ہوں، پر بے وقوف قاتل نہیں ہوں۔ میں تیرے وہیں نہیں چھوڑ آیا، محفوظ پڑی ہے۔“

دلیر خاموش رہا اور شہباز بولتا گیا، ”دلیر خاں! یہ جنت کتنی عجیب عورت ہے۔ خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے گھڑا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی ساری دکان لڑکیوں کو کھلا دی، پر میں ایسا بے وقوف نہیں ہوں۔ میں تو اپنا سب کچھ جنت کی نذر کرتا رہا اور جب دکان بند ہو گئی تو مجھ پر سب سے زیادہ وہی ہنسی۔ جب سے میں نے قسم کھالی تھی کہ جنت کو اپنی ماں کی بہو بنا کر نہ لاؤں تو کافر ہو کر مروں۔ تم مجھ سے نہ بھی کہتے تو میں تھوڑے دنوں میں اللہ دین کو چلتا کر دیتا۔ تم نے تو خیر خدا ترسی سے مجھے ایسا کرنے کو کہا، پر میں جھوٹ کیوں بولوں، میں نے تو اپنی قسم کا ایک حصہ پورا کیا ہے۔ اب یہ مقدمہ ادھر ادھر ہو لے تو قسم کا دوسرا حصہ بھی پورا کروں گا اور اگر اس نے اکڑ دکھائی تو میں اسے بتاؤں گا کہ تیرا ایک گردن کاٹنے کے بعد ہمیشہ کے لئے کند نہیں ہو جاتی اور عورت کی گردن تو ریشم کا تار ہوتی ہے، چاقو سے بھی کٹ سکتی ہے۔“

”کہیں تمہارے سر پر خون تو سوار نہیں ہو رہا ہے شہباز؟“ دلیر نے اس سے عجیب سی آواز میں پوچھا۔

جواب میں شہباز مسکرا دیا۔ ”یہ میرا پہلا خون ہے پر دلیر خاں! میرا ظرف اتنا چھوٹا نہیں ہے۔ میں تو تمہیں بھی قتل کر دوں تو سیٹی بجاتا پھروں۔“

دلیر ذرا سا چونکا مگر پھر سنبھلا اور مسکرا دیا۔ پھر اس نے شہباز کے بازو کو اپنے پنجے میں بھینچ کر کہا۔ ”تمہاری چال سے، تمہاری نظروں سے، تمہاری باتوں سے کچھ بھی ظاہر نہ ہو۔“

شہباز نے نکمبیوں سے اپنے بازو پر دلیر کے بھینچے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے چمڑا کر بولا ”ظاہر ہو بھی جائے تو تم تسلی رکھو کہ میں اپنے یار کا نام بھانسی کے تختے پر بھی نہیں لوں گا۔“

”وہ تو مجھے پتہ ہے۔“ دلیر نے شہباز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”پر تمہارا نام ظاہر ہوا تو سمجھو میرا نام ظاہر ہو گیا۔ تم پکڑے گئے تو میں کیسے چپ بیٹھ سکوں گا۔ میں یاروں کا یار ہوں۔“

صبح چمک اٹھی تھی اس لئے دونوں چو پال سے اتر کر گلیوں میں ہو لئے۔ جب شہباز، اللہ دین کے ہاں پہنچا تو دلیر اس سے پہلے موجود تھا اور کسانوں کی ایک ٹولی کے سامنے مرنے والے کی خوبیاں بیان کر رہا تھا۔ پولیس کا انتظار ہو رہا تھا۔ نبرد ار اندر کوٹھے میں اللہ دین کی لاش کے پاس ایک

مونڈھے پر بیٹھا جیسے پہرہ دے رہا تھا۔ شہباز نے لاش جہاں چھوڑی تھی وہیں رکھی تھی۔ اللہ دین کے کٹے ہوئے سر کو بھی نیچے زمین پر ایک ٹوکڑے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ٹوکڑے کے آس پاس جنت کی سبز سرخ اور نیلی چوڑیاں ٹوٹی ہوئی پڑی تھیں۔ سامنے جنت عورتوں میں گھری بیٹھی تھی۔ اس کے کھلے بال اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اور پڑوسن اسے سہارا دے کر پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کا بھائی نور اللہ ایک طرف بت کی طرح کھڑا تھا۔

باہر ٹولیوں کی کھسر پھسر سے شہباز نے اخذ کیا کہ زیادہ شہ نور اللہ پر کیا جا رہا ہے جس نے ایک بار اللہ دین کو ڈپٹ کر کہا تھا کہ اگر تم نے آئندہ میری بہن پر ہاتھ اٹھایا تو ہاتھ کاٹ لوں گا۔ بیچ بچاؤ ہو گیا تھا ورنہ اُس روز دونوں میں سے ایک ضرور قتل ہو جاتا۔ کہتے ہیں کہ اس روز نور اللہ سیدھا اپنی بہن کے پاس آیا تھا اور کہا تھا ”چل میرے ساتھ۔“ اور جنت نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا تھا۔ ”جب تم مجھے اس ظالم کے حوالے کر رہے تھے تو جب کیوں نہیں سوچا تھا۔ اُس وقت بھی تو سارا گاؤں جانتا تھا کہ وہ مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا ہے۔ میں تو اب مرتے دم تک یہیں رہوں گی۔“

دو پہر کو شہباز کھانا کھلانے کے لئے پٹنگ پر بیٹھا ہی تھا اور اس کی ماں چنگیر میں کھانا رکھے چولہانے سے اٹھی ہی تھی کہ چوکیدار آیا اور اس نے بتایا کہ شہباز خاں کو تھانے دار نے دلیر خاں کی چو پال پر بلایا ہے۔ چوکیدار کے ساتھ ایک سپاہی بھی تھا۔ اس لئے اپنی بے خوفی اور بے پروائی کا مظاہرہ کرنے کے لئے شہباز اٹھا اور ماں سے بولا۔ ”رہنے دے ماں، ابھی واپس آ کر کھالوں گا۔ دیکھوں تو تھانیدار کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے۔“ پھر وہ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا اٹھا اور چلا گیا۔

شہباز چو پال پر پہنچا تو نور اللہ کو جھکڑیاں لگ چکی تھیں۔ دلیر نے شہباز کو آنکھ ماری۔ پھر تھانے دار دلیر کو اندر کوٹھے میں لے گیا۔ کافی دیر تک سارا گاؤں باہر سانس روکے بیٹھا رہا۔ بس سپاہی یا گاؤں کا نمبردار یا اللہ دین کا چاچا یا جنت اور نور اللہ کا باپ اندر آتے جاتے رہے اور جب مسجد میں ظہر کی اذان ہوئی تو شہباز باہر آیا مگر وہ جھکڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے زرد چہرے پر اکڑی ہوئی مونچھیں اجنبی سی لگ رہی تھیں۔

شہباز کی جھکڑیاں دیکھ کر لوگ ششدر رہ گئے۔ پھر دلیر جس کے سر پر آج کلاوہ والی طرہ دار چڑھی آگئی تھی اور جو اپنے سفید براق لباس میں علاقے کا رئیس معلوم ہوتا تھا، تھانیدار کے قریب کی چارپائی سے اٹھا اور دست بستہ بولا۔ ”دیکھئے حضور! اللہ دین کے قتل نے میرے دل کا خون کر دیا ہے۔ وہ اس گاؤں کا بیٹا تھا اس لئے ہم سب کا بیٹا تھا۔ مگر شہباز خاں کو بھی ہم سب جانتے ہیں اور میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ شہباز ایک اللہ دین ہی کیا! کسی کے قتل میں شامل نہیں ہو سکتا۔ جس شخص نے کبھی چاقو سے ایک پتی ٹہنی نہیں کاٹی، وہ تیرے اتنے بڑے جوان کا سر کیسے کاٹ سکتا ہے۔ پھر اللہ دین کے ساتھ اس کی نہ کوئی دشمنی تھی نہ دوستی تھی۔ قتل کرنے والے ایسے نہیں ہوتے۔ وہ دوسری طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں۔“

جب دلیر بول رہا تھا تو شہباز کو ایسا لگا جیسے وہ سارے گاؤں کے سامنے اس پر جوتے برس رہا ہے۔ اس نے پگڑی کو سر پر بجانے کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ہتھکڑیاں جیسے اس پر پھنس پڑیں۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ ایسی بے عزتی برداشت کرنے سے تو قتل کا اقبال کر لیتا بہتر ہے۔ مگر جب دلیر بول چکا تو پلٹ کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے شہباز کو آنکھ مار دی اور شہباز اپنی حماقت پر شرمندہ ہو گیا۔ اگر وہ بک بیٹھتا تو؟ کچھ دیر بعد جب تھانے دار کچھ لکھنے میں مصروف تھا دلیر اٹھا اور شہباز کے پاس جا بیٹھا۔ پھر موقع پا کر اس نے آہستہ سے کہا: ”ساری کارستانی اس حرا حرا دی کی معلوم ہوتی ہے۔“

ایک دم شہباز کا جی چاہا کہ ہتھکڑیوں کو ایک جھٹکے سے توڑ کر بھاگے اور جنت کے گھر جا کر اس کی بوئیاں کتوں کی طرح دانتوں سے کاٹ لے۔ یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنے خوبصورت جسم میں اتنی بدصورت نیت بھی چھپ سکتی ہے۔ یکا یک اس نے عزم کیا کہ وہ پولیس کے سامنے بھی اپنے جرم کا اقبال نہیں کرے گا تاکہ اس کے پھانسی لگ جانے کا کوئی دور دراز کا بھی امکان پیدا نہ ہو۔ پھر جس روز وہ بری ہو کر گاؤں واپس آئے گا تو اپنے گھر جانے کی بجائے سیدھا جنت کے ہاں پہنچے گا اور سب کے سامنے اس سے خوب سختی کے ساتھ لپٹ کر اور اچھی طرح چوم کر اس کا گلا گھونٹ دے گا۔

شہباز اور نور اللہ نے پولیس کے سامنے بھی اپنے جرم کا اقبال نہ کیا اور عدالت میں بھی ثابت قدم رہے۔ بس اتنا ہوا کہ نور اللہ کبھی کبھی رو دیتا تھا اور شہباز کہتا تھا: ”بس مجھے تو حسرت ہے شہباز کہ اللہ دین میرے ہاتھوں کیوں قتل نہ ہوا۔ کسی دوسرے نے میرا یہ حق کیوں چھین لیا۔“ شہباز کے باپ نے اپنے بہترین کھیت بچ کر ضلع کے بہترین وکیل کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ دلیر خاں بھی ہر پیشی پر آتا تھا اور شہباز کو دیر تک تسلیاں دیتا رہتا تھا۔ ایک بار شہباز نے جنت کا پوچھا تو دلیر بولا ”استغاثے کے گواہوں میں سب سے پہلا نمبر جنت کا ہے۔ کہہ رہی تھی کہ میں نے تو پولیس کی سختی سے بچنے کے لئے شہباز خاں کا نام لے دیا تھا ورنہ میں ایسی کمینی نہیں کہ عدالت میں بھی اسی کا نام لوں۔ کہہ رہی تھی کہ میں تو مر بھی جاؤں تو شہباز خاں کا احسان نہیں اتار سکتی۔“

استغاثے کے گواہوں کی باری آئی تو سب سے پہلے جنت اپنے باپ کے ساتھ عدالت میں داخل ہوئی۔ وہ شہباز کو اتنی خوبصورت لگی کہ اگر اتنی خوبصورت اس رات لگتی جب اس نے اللہ دین کو قتل کیا تھا تو وہ قتل کرنے سے پہلے صبح کی اذان تک اسے مسلسل پیار کرتا رہتا۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے جنت کے گہرے سرخ ہونٹوں کے گوشے ذرا سا کانپنے ہیں اور اس کی بے حد کالی آنکھوں میں ٹٹماہٹ سے پیدا ہوئی ہے۔

مگر جب جنت کا بیان شروع ہوا تو شہباز نے کنہرے کے جنگلے کو اس زور سے پکڑا کہ اگر اسنے زور سے کسی کا بازو پکڑتا تو اس کی انگلیاں بازو کی ہڈی تک میں اتر جاتیں۔ جنت نے عدالت کو بتایا کہ ”جب میں آدمی رات کو اللہ دین کی غرغراہٹ کی آواز سے جاگی تو شہباز ہاتھ میں تہ لے کھڑا تھا۔ ہم رات بھر چراغ جلائے رکھتے تھے کیونکہ اللہ دین دشمنوں والا آدمی تھا۔ میں نے اس چراغ کی روشنی میں شہباز کو پہچان لیا اور میں ڈر گئی۔ میں اس لئے ڈر گئی کہ شہباز نے ہمیشہ مجھے بھوکے نظروں سے دیکھا اور جب میں نے اللہ دین کو بتایا کہ شہباز مجھے گلی میں آتے جاتے گھورتا ہے اور اشارے کرتا ہے تو اللہ دین جو بڑے غصے والا آدمی تھا، ہنسا اور بولا ”شیر چو ہے نہیں مارا کرتے۔“

اس وقت شہباز کو ایسا لگا جیسے عدالت سمیت سب لوگوں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا ہے اور سب مسکرا رہے ہیں۔ جنت بھی ذرا دیر کو رک گئی اور شہباز کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر شہباز کنہرے کے جنگلے پر سے نظریں اٹھاتا تو اس کی نظریں جنت سے ملتیں۔

پھر جنت نے کہا، ”اس وقت بھی، جب وہ ہاتھ میں تہ لے کھڑا تھا تو بولا ”میں تمہارا عاشق ہوں اس لئے اپنی راہ کا روڑا ہٹانے آیا ہوں۔“ اور جب میں نے چیتنا چاہا تو اس نے میرے گلے پر تہ کی دھار رکھ دی اور اس کے بعد میں بے ہوش ہو گئی۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو صبح کی اذان ہو رہی تھی اور اللہ دین کا سر نیچے پڑا ہوا تھا اور چوٹیوں کی ایک قطار اس میں گھس جا رہی تھی۔“

بہت دیر تک شہباز کے دماغ کی رگیں کھینچتی، انٹھتی اور ٹوٹتی رہی، اس لئے نہ تو وہ کچھ سوچ سکا اور نہ یہ سن سکا کہ اس کے وکیل نے جنت پر کیا جرح کی ہے۔ صرف جب وہ گواہوں کے کنہرے سے نکلی اور اپنے بھائی کے قریب سے گزرنے کی کوشش میں شہباز کے قریب سے بھی گزری تو شہباز نے سوچا کہ یہ حرامزادی اتنی خطرناک گواہی دینے کے باوجود اسے خوبصورت کیوں لگ رہی ہے۔ پھر نے سوچا کہ کوڑیوں والا سانپ بھی تو خوبصورت ہوتا ہے۔

اگر مقدمے میں نور اللہ بھی ماخوذ نہ ہوتا تو جنت کی گواہی پر شہباز کا پھانسی لگ جانا یقینی تھا، مگر اس کے وکیل نے نور اللہ کی موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ دیر تک یہ ثابت کرتا رہا کہ جنت نے جو گواہی دی ہے اس میں اپنے شوہر کے قاتل کو سزا دلوانے کی خواہش کم تھی اور اپنے سکے بھائی کو چھڑانے کی خواہش زیادہ تھی۔ اس خواہش کو پورا کرنے کا واحد راستہ یہ تھا کہ جنت سارا الزام بے چارے شہباز پر دھر دے، جو نہ لینے میں ہے نہ دینے میں، نہ تین میں ہے نہ تیرہ میں۔ ”آپ ہی غور فرمائیے کہ ساڑھے چار فٹ کا یہ جوان ساڑھے پانچ فٹ کی اس بھرپور جوانی والی عورت سے محبت کرنے کا حوصلہ بھی کر سکتا ہے؟“

اس موقع پر شہباز کے دماغ میں یہ جذبہ کھولنے لگا کہ وہ اپنے وکیل کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے اپنے جرم کا اقبال کر لے۔ مگر جنت سے انتقام لینے کی

امنگ نے اس کی زبان روک لی۔ دوسرے گواہوں پر بھی اس کے وکیل نے ایسی ہی جرح کی اور آخر جب فیصلہ سنایا گیا تو دونوں ملزم بری قرار پائے اور اللہ دین کا قتل ضائع ہو گیا۔

شہباز کے ساتھ صرف اس کا باپ تھا جو خوشی سے رو رہا تھا۔ نور اللہ اپنے باپ کے ساتھ ایک طرف نکل گیا۔ جنت کی گواہی کے بعد دلیر نے عدالت میں آنا چھوڑ دیا تھا۔

جب بس شہباز کے گاؤں کی طرف روانہ ہوئی تو کتنی بار شہباز کا دل چاہا کہ وہ بس سے اترے اور بھاگنے لگے۔ اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ بس سے بھی پہلے گاؤں پہنچ جائے گا۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ بس کی سست رفتار سے جنت کی زندگی خواہ مخواہ طول کھینچے جا رہی ہے۔

بس سے اترتے ہی اسے ایک ہجوم نے گھیر لیا۔ لوگ اسے یوں عقیدت سے مل رہے تھے جیسے ہیروں فقیروں سے ملتے ہیں۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ پستہ قد ہونا کچھ ایسی بری بات نہیں۔ ہاتھوں پر انسانی خون کے چھینے ہوں تو دود گنز کے جوان بھی بالشتیے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

اس ہجوم نے اسے فوری طور پر جنت کے گھر کی راہ اختیار نہ کرنے دی۔ وہ لوگوں میں گھرا ہوا اپنے گھر آیا تو روتی ہوئی ماں نے اسے پٹنگ پر بٹھا کر تازہ کھانا اس کے سامنے رکھ دیا اور بولی ”پہلے کھانا کھالے بیٹا۔ تو جس دن سے یہاں سے گیا تھا یہ کہہ کے گیا تھا کہ ابھی واپس آ کے کھانا کھائے لیٹا ہوں۔“ اس کی برادری نے محکم میں گولے چھوڑے اور سوجی چینی اور خالص گھی کے دو کڑاھے بطور خیرات کے بانٹے۔ رات گئے تک اس کے ہاں مردوں اور عورتوں کا تانتا بندھا رہا۔ اس ہجوم میں دلیر بھی آیا اور سب کے سامنے اس کے ہاتھ چوم کر چلا گیا۔

آدھی رات کو جب شہباز کے ماں باپ سو رہے تھے، وہ گھر سے نکلا اور ایک کھیت میں جا کر ایک بیروٹے کے نیچے زمین کھودنے لگا۔ پھر وہاں سے اس نے اپنے پٹکے میں لپیٹی ہوئی تمبر نکالی۔ اسے ایک پتھر پر رگڑتا رہا اور پھر جنت کے گھر کی راہ لی۔

اسوج کے دن تھے جب دوپہر کو گرمی اور رات کو سردی لگتی ہے۔ جب کسانوں کے قول کے مطابق خون پانی ایک ہو جاتے ہیں اور پتھروں کے نیچے سے بھی پھول نکل آتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوائ نے شہباز کے ریشمی کرتے میں گھس کر اسے پھلادیا تھا اور چاندی کی زنجیر مسلسل بول رہی تھی۔ لیڈی ہملٹن کے تہبند کے پلو پھڑ پھڑا رہے تھے اور اس کے منہ جوتے کے تلے چیخ رہے تھے۔ مگر تہبند کو سمیٹنے اور جوتا اتار کر ہاتھ میں لینے کی بجائے شہباز سوچ رہا تھا کہ وہ جاتے ہی جنت کو قتل کر دے یا پہلے اس سے لپٹ جائے، اسے پیار کرے، اسے سہلائے اور ٹٹولے اور جب وہ اس کے پہلو میں سو جائے تو بڑی نرمی سے اس کی گردن کاٹ کر تھانے چلا جائے اور تھانیدار سے کہے کہ مجھے جھکڑی لگا لیجئے۔

بار بار اس کے دماغ نے جنت کو زندہ رکھنے کے بہانے بھی گھڑے۔ ہو سکتا ہے وہ شہباز کے پیچھے ہی اس کی ناگھوں سے لپٹ جائے اور اس کے

قدموں پر آنسو گر کر کہے کہ مجھے معاف کر دے شہباز! میں تو تیرے عشق سے ڈر گئی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ شہباز کو دیکھتے ہی اٹھے اور کہے کہ مجھے تو پیارے اسی گھڑی کا انتظار تھا۔ اب چل اور مجھے اپنے ساس کے پاس لے جا۔ میری ساس جو تیری ماں ہے۔ مگر ان سب بہانوں کی جڑوں کو جنت کے یہ الفاظ آڑے کی طرح کاٹ ڈالنے کہ ”جب میں آدمی رات کو اللہ دین کی غرغراہٹ کی آواز سے جاگی تو شہباز ہاتھ میں تیرے کھڑا تھا۔“ جنت کے گھر کے پاس پہنچ کر اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے جوتے چمچ رہے ہیں اور تہبند پھڑپھڑا رہی ہے۔ اس نے جوتے بغل میں دبائے، تہبند کو لنگوٹ کی طرح کس لیا اور تہ کے دستے کو ہاتھ میں یوں جکڑ لیا جیسے جنت اس سے بس ایک ہی قدم کے فاصلے پر ہے۔ جنت کے کوٹھے کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے اس ٹھنڈی رات میں بھی اسے پسینہ آ گیا اور تہبند ہی ہوئی تھیلی میں سے تہر کا دستہ ایک بار پھسل سا گیا۔

مگر جنت کے گھر کے دروازے میں تو قفل پڑا ہوا تھا۔ ایک دم اسے خیال آیا کہ آخر نور اللہ بھی تو بری ہو کر آیا ہوگا۔ ممکن ہے وہ میکے گئی ہو۔ وہ یوں بھاگ کھڑا ہوا جیسے جنت اس کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے اور وہ اس کے تعاقب میں ہے۔ جنت کے میکے میں دو آدمی صحن میں کھل لپٹے سو رہے تھے مگر ان میں ایک جنت کی ماں تھی اور دوسری جنت کی چھوٹی بہن۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ گاؤں میں ایک ہی تو بس آتی ہے اور اس بس میں جنت کا بھائی سوار نہیں ہوا تھا۔ وہ تو اپنے باپ کے ساتھ کچہری سے نکل کر بازار کی طرف جا رہا تھا۔ وہ تو شاید کل آئے۔ مگر کیا جنت بھی اپنے باپ کے ساتھ اپنے بھائی کو لینے ضلع کے صدر مقام گئی ہوئی تھی۔

وہ عدالت میں اپنے خلاف جنت کا بیان سن کر بھی اتنا اداس نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت اداس تھا۔ اس کے سینے میں کچھ ایسا غبار سا جمع ہو گیا تھا کہ اگر اس وقت اسے جنت مل جاتی تو وہ اسے قتل کرنے سے پہلے اس کے سامنے بچوں کی طرح رو دیتا۔ جنت کو غائب پا کر اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ دنوں سے بھوکا تھا اور بڑی دقت کے بعد اب جو نور اللہ اس کے ہاتھ میں آیا تھا اسے کوئی جھپٹ کر لے اڑا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ اپنے گھر جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی قسم پوری نہیں کر سکا اور ایک نامی جوان کا خون کرنے کے باوجود ہاتھ بھر کا ایک حقیر آدمی ہے۔

اس نے چو پال کی راہ لی۔ کچھ دیر تک ایک ٹوٹے ہوئے کھٹولے پر لیٹا رہا۔ پھر وہ چونک کر اٹھا اور جیسے کچھ سننے لگا۔ جوتے وہیں چھوڑ کر، تہبند کے پلو سیٹ کر اور تہر کو جسم سے چٹائے وہ پنجوں کے بل اس کوٹھے کے دروازے تک آیا جہاں سے وہ آج سے چار مہینے پہلے جھٹکڑیاں پہنے نکلا تھا۔ چند لمحوں تک وہ دروازے پر کان رکھے کھڑا رہا۔ پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر وہ دروازے کی طرف لپکا اور اپنے جسم کو کواڑوں پر پھڑکی طرح دے مارا۔ ایک کواڑ ٹوٹ کر اندر جاگرا اور اس کے ساتھ ہی شہباز بھی اندر جاگرا۔

قدموں پر آنسو گر کر کہے کہ مجھے معاف کر دے شہباز! میں تو تیرے عشق سے ڈر گئی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ شہباز کو دیکھتے ہی اٹھے اور کہے کہ مجھے تو پیارے اسی گھڑی کا انتظار تھا۔ اب چل اور مجھے اپنے ساس کے پاس لے جا۔ میری ساس جو تیری ماں ہے۔ مگر ان سب بہانوں کی جڑوں کو جنت کے یہ الفاظ اڑے کی طرح کاٹ ڈالنے کہ ”جب میں آدمی رات کو اللہ دین کی غرغراہٹ کی آواز سے جاگی تو شہباز ہاتھ میں تیرے کھڑا تھا۔“ جنت کے گھر کے پاس پہنچ کر اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے جوتے چمچ رہے ہیں اور تہبند پھڑپھڑا رہی ہے۔ اس نے جوتے بغل میں دبائے، تہبند کو لنگوٹ کی طرح کس لیا اور تہ کے دستے کو ہاتھ میں یوں جکڑ لیا جیسے جنت اس سے بس ایک ہی قدم کے فاصلے پر ہے۔ جنت کے کوٹھے کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے اس ٹھنڈی رات میں بھی اسے پسینہ آ گیا اور تہبند ہی ہوئی تھیلی میں سے تہر کا دستہ ایک بار پھسل سا گیا۔

مگر جنت کے گھر کے دروازے میں تو قفل پڑا ہوا تھا۔ ایک دم اسے خیال آیا کہ آخر نور اللہ بھی تو بری ہو کر آیا ہوگا۔ ممکن ہے وہ میکے گئی ہو۔ وہ یوں بھاگ کھڑا ہوا جیسے جنت اس کے ہاتھوں سے ٹکلی جا رہی ہے اور وہ اس کے تعاقب میں ہے۔ جنت کے میکے میں دو آدمی صحن میں کھل لپٹے سو رہے تھے مگر ان میں ایک جنت کی ماں تھی اور دوسری جنت کی چھوٹی بہن۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ گاؤں میں ایک ہی تو بس آتی ہے اور اس بس میں جنت کا بھائی سوار نہیں ہوا تھا۔ وہ تو اپنے باپ کے ساتھ کچہری سے نکل کر بازاری طرف جا رہا تھا۔ وہ تو شاید کل آئے۔ مگر کیا جنت بھی اپنے باپ کے ساتھ اپنے بھائی کو لینے ضلع کے صدر مقام گئی ہوئی تھی۔

وہ عدالت میں اپنے خلاف جنت کا بیان سن کر بھی اتنا اداس نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت اداس تھا۔ اس کے سینے میں کچھ ایسا غبار سا جمع ہو گیا تھا کہ اگر اس وقت اسے جنت مل جاتی تو وہ اسے قتل کرنے سے پہلے اس کے سامنے بچوں کی طرح رو دیتا۔ جنت کو غائب پا کر اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ دنوں سے بھوکا تھا اور بڑی دقت کے بعد اب جو نور اللہ اس کے ہاتھ میں آیا تھا اسے کوئی جھپٹ کر لے اڑا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ اپنے گھر جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی قسم پوری نہیں کر سکا اور ایک نامی جوان کا خون کرنے کے باوجود ہاتھ بھر کا ایک حقیر آدمی ہے۔

اس نے چوپال کی راہ لی۔ کچھ دیر تک ایک ٹوٹے ہوئے کھٹولے پر لیٹا رہا۔ پھر وہ چونک کر اٹھا اور جیسے کچھ سننے لگا۔ جوتے وہیں چھوڑ کر، تہبند کے پلو سیٹ کر اور تہر کو جسم سے چٹائے وہ پنجوں کے بل اس کوٹھے کے دروازے تک آیا جہاں سے وہ آج سے چار مہینے پہلے جھٹکڑیاں پہنے نکلا تھا۔ چند لمبے تک وہ دروازے پر کان رکھے کھڑا رہا۔ پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر وہ دروازے کی طرف لپکا اور اپنے جسم کو کواڑوں پر پھڑکی طرح دے مارا۔ ایک کواڑ ٹوٹ کر اندر جاگرا اور اس کے ساتھ ہی شہباز بھی اندر جاگرا۔

اندر کڑوے تیل کا چراغ ٹھنارہا تھا اور جنت جس نے اپنا کرتا اتار رکھا تھا، دلیر کی ران پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ کواڑ کے ٹوٹے ہی دونوں یوں اکڑ کر کھڑا ہو گئے کہ اپنے قدوں سے بھی لمبے لگنے لگے۔ اسی ایک لمحے میں شہباز نے اپنے جسم کو چٹان کی طرح اٹھایا اور دلیر کے پیٹ میں دے مارا۔ دلیر تورا یا تو اس نے بجلی کی سی تیزی سے تیر اس کے پیٹ پر دے ماری۔ پہلے ہی وار سے دلیر کی آنتیں باہر ابل پڑیں اور وہ ہوا میں کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

پلٹ کر اس نے جنت کی طرف دیکھا تو جنت نے چیخ ماردی اور پھر وہ ایک گوشے میں یوں تراخ سے جا گھسی جیسے پار نکل جائے گی۔ تیر کو فرش پر پھٹی ہوئی گھاس سے پونچھتے ہوئے وہ بولا ”میں تیرا خون نہیں کروں گا۔ تیرا خون میری تیر کے لائق نہیں ہے۔“ پھر اس نے جنت کا کرتا اٹھا کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا ”لے اے پہن لے۔ ننگی عورت لاش کے پاس کھڑی ہوئی بھلی نہیں لگتی۔“ اور جب جنت کرتا پہن رہی تھی تو وہ بولا ”تجھے پیار کرنے کو بڑا جی چاہتا ہے، پر اب تو میں یہ پیار صرف اس طرح کر سکتا ہوں کہ تیر سے تیرے ہونٹ تیرے جسم سے الگ کر لوں اور پھر ان پر اپنے ہونٹوں رکھ دوں۔ مگر میں ایسا بھی نہیں کروں گا۔ چھانسی پر چڑھنے سے پہلے میں اپنے ہونٹوں کو پلید نہیں کرتا چاہتا۔ میں تو.....“

اچانک شہباز خاموش ہو گیا۔ مسجد میں صبح کی اذان ہونے لگی تھی۔

